AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com

Vol. 3, No.1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

تصوراتِ زمان و مکاں اور ادب: انسلاک، اطلاق اور امکان

Concepts of Time and Space in Literature: Connection, Application and Possibility

صبا صادق

اسکالر پی ایچ ڈی اردو، الحمد اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد کیمپس

ڈاکٹر مظفر حسین

اسسٹنٹ پروفیسر اردو، الحمد اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد کیمپس

Abstract: Time and space are among the oldest questions of human thought, and literature has always been a place where they are both examined and made. This article studies the concepts of time and space and their relation to literature under three heads: connection, application and possibility. It first outlines the lexical, philosophical, scientific and religious dimensions of the two concepts, from Augustine, Newton and Kant to Bergson, Heidegger, Minkowski and Iqbal, together with the spatial theories of Tuan, Bachelard, Lefebvre and Foucault. It then shows how literature, a temporal art that also creates space, is bound to these concepts, drawing on Lessing, Joseph Frank, Ricoeur and Bakhtin's chronotope, and identifies five levels at which Urdu writers have used time and space, with examples from Mir Amman, Ghalib, Nazir Ahmad, Qurratulain Hyder, Intizar Husain, Shaukat Siddiqui and Mustansar Hussain Tarar. A five-level method of critical application is proposed: story time and narrating time, order and pace, the nature of time, layers of space, and the chronotope. The method is tested on Manto's "Toba Tek Singh" and Iqbal's "Masjid-e-Qurtuba". The article closes by indicating new directions for Urdu research in memory studies, historical fiction, ecocriticism, globalization and gendered space.

Keywords: Time, Space, Chronotope, Narratology, Urdu Fiction, Critical Application

اردو تلخیص:

زمان و مکاں انسانی فکر کے قدیم ترین سوالات میں سے ہیں۔ اس مقالے میں زمان و مکاں کے تصورات اور ادب سے ان کے رشتے کا مطالعہ تین عنوانات کے تحت کیا گیا ہے: انسلاک، اطلاق اور امکان۔ پہلے حصے میں ان کی لغوی، فلسفیانہ، سائنسی اور مذہبی جہات کا جائزہ ہے جن میں مغربی فلسفہ، جدید طبیعیات، اسلامی فکر اور مکان کے جدید نظریات شامل ہیں۔ دوسرے حصے میں لیسنگ، جوزف فرینک، ریکور اور باختن کے کرونوٹوپ کی روشنی میں ادب اور زمان و مکاں کے انسلاک پر بات کی گئی ہے اور اردو ادب کی مثالوں سے وہ پانچ سطحیں واضح کی گئی ہیں جن پر تخلیق کار وقت اور مکان کو برتتا ہے۔ تیسرے حصے میں تنقیدی اطلاق کا ایک پانچ سطحی طریقِ کار تجویز کیا گیا ہے، یعنی قصے اور بیان کا زمان، ترتیب اور رفتار، وقت کی نوعیت، مکان کی پرتیں اور کرونوٹوپ اور اسے منٹو کے افسانے ٹوبہ ٹیک سنگھ اور اقبال کی نظم مسجدِ قرطبہ پر آزمایا گیا ہے۔ آخر میں یادداشت، تاریخی فکشن، ماحولیات، عالمگیریت اور صنفی مکان کے حوالے سے اردو تحقیق کے نئے امکانات کی نشاندہی کی گئی ہے۔

کلیدی الفاظ: زمان، مکان، کرونوٹوپ، بیانیات، اردو فکشن، تنقیدی اطلاق

Vol. 3, No.1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

ہر ادبی متن کسی نہ کسی وقت میں لکھا جاتا ہے اور کسی نہ کسی جگہ پر پڑھا جاتا ہے، مگر معاملہ یہاں ختم نہیں ہوتا۔ متن کے اندر بھی ایک وقت ہوتا ہے جو گھڑی سے نہیں ناپا جاتا اور ایک جگہ ہوتی ہے جو نقشے پر نہیں ملتی۔ داستان کا شہزادہ برسوں کا سفر ایک رات میں طے کر لیتا ہے، غزل کا شاعر ایک لمحے میں ازل اور ابد کو چھو لیتا ہے، اور ناول کا کردار ایک کمرے میں بیٹھا بیٹھا پورا بچپن دوبارہ جی لیتا ہے۔ ادب کا یہ وقت اور یہ مکان کس طرح بنتے ہیں، ان کا فلسفیانہ اور سائنسی تصورات سے کیا رشتہ ہے، تخلیق کار انھیں کس طرح برتتا ہے اور نقاد کسی متن میں انھیں کس طرح شناخت کر سکتا ہے، یہ وہ سوالات ہیں جن پر اس مقالے میں غور کیا گیا ہے۔

اردو تنقید میں وقت کا ذکر نیا نہیں۔ غالب کے ہاں امکان کے دشت اور عمر کے رخش پر، اقبال کے ہاں سلسلۂ روز و شب پر اور قرۃ العین حیدر کے ہاں تاریخ کے دریا پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اس کے باوجود زیادہ تر مباحث موضوعاتی رہے ہیں، یعنی یہ دیکھا گیا کہ فلاں شاعر یا ادیب وقت کے بارے میں کیا کہتا ہے۔ یہ سوال کم اٹھایا گیا کہ متن اپنی ساخت میں وقت اور مکان کو کس طرح تشکیل دیتا ہے۔ ڈاکٹر ناہید قمر نے اردو فکشن میں وقت کے تصور پر جو مفصل کام کیا اس میں شعور کی رو اور زمانی ترتیب کے ٹوٹنے کی نشاندہی موجود ہے [1]، مگر مکان کا سوال اور زمان و مکاں کی باہمی وابستگی وہاں مرکزی مسئلہ نہیں۔ اسی طرح بیانیات کے مغربی نظریات اردو میں متعارف تو ہوئے ہیں [2]، لیکن ان کا کسی باقاعدہ طریقِ کار کی صورت میں اردو متون پر اطلاق کم ہوا ہے۔ یہ مقالہ اسی خلا کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے۔

مقالے کی ترتیب اس کے عنوان کے تین اجزا کے مطابق ہے۔ پہلے حصے میں زمان و مکاں کے تصور اور اس کی جہات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں ادب سے اس کے انسلاک پر بات کی گئی ہے، یعنی یہ کہ ادب بطورِ فن وقت اور مکان سے کس طرح جڑا ہوا ہے اور تخلیق کار اسے کس کس صورت میں برتتا ہے۔ تیسرے حصے میں تنقیدی اطلاق کا ایک طریقِ کار تجویز کیا گیا ہے اور ایک مختصر متن پر اسے آزمایا گیا ہے۔ آخر میں ان امکانات کا ذکر ہے جو اس زاویۂ نظر سے اردو تحقیق کے لیے کھلتے ہیں۔ مثالوں کے انتخاب میں احتیاط برتی گئی ہے اور زیادہ تر ان متون کو لیا گیا ہے جو اردو قاری کے لیے معروف ہیں اور جن کے بارے میں کوئی دعویٰ متن کی شہادت کے بغیر نہیں کیا گیا۔

اردو میں وقت کے لیے کئی لفظ ہیں اور ان میں ہر ایک کا اپنا رنگ ہے۔ "وقت" عموماً کسی خاص لمحے یا مقدار کی طرف اشارہ کرتا ہے، "زمانہ" ایک پھیلے ہوئے دور کی طرف، "دہر" کائناتی اور لامتناہی وقت کی طرف اور "عصر" ایک عہد یا ایک نسل کے تجربے کی طرف۔ مکان کے لیے بھی "جگہ"، "مقام"، "فضا" اور "خلا" جیسے الفاظ ملتے ہیں جو ایک دوسرے کے مترادف نہیں۔ یہ لغوی تنوع اس بات کا ثبوت ہے کہ ہماری زبان وقت اور جگہ کو ایک اکہری حقیقت کے طور پر نہیں بلکہ کئی پرتوں والے تجربے کے طور پر محسوس

Vol. 3, No.1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

کرتی رہی ہے۔ قرآنِ حکیم میں "عصر" کی قسم کھا کر انسان کے خسارے کا ذکر کیا گیا ہے[3] اور ایک اور مقام پر کہا گیا ہے کہ تیرے رب کے ہاں ایک دن تمھاری گنتی کے ہزار برس کے برابر ہے[4]۔ پہلی آیت وقت کو اخلاقی آزمائش کا میدان بناتی ہے اور دوسری وقت کے پیمانے کو اضافی ٹھہراتی ہے۔ صحیح مسلم کی حدیث میں زمانے کو برا کہنے سے منع کیا گیا ہے کیونکہ زمانہ اللہ ہی کی طرف سے ہے[5]، یہی حدیث بعد میں اقبال کے تصورِ زمان کا ایک اہم حوالہ بنی۔

مغربی فلسفے میں وقت کی بحث کا ایک مشہور نقطۂ آغاز آگسٹائن (Augustine) کا وہ اعتراف ہے جو اس نے اپنے اعترافات کی گیارھویں کتاب میں کیا کہ جب تک کوئی اس سے وقت کے بارے میں نہیں پوچھتا وہ جانتا ہے کہ وقت کیا ہے، مگر جب کوئی پوچھ لے اور وہ سمجھانا چاہے تو نہیں جانتا[6]۔ آگسٹائن نے یہ بھی کہا کہ ماضی حافظے میں، حال توجہ میں اور مستقبل توقع میں موجود ہے، یعنی وقت کی اصل جگہ انسان کا ذہن ہے۔ یہ بات قدیم فلسفے کی ان کوششوں سے بہت مختلف تھی جن میں وقت کو آسمانوں کی گردش سے ناپا جاتا تھا۔ اردو میں عزیز احمد نے اسی الجھن کو اپنے لفظوں میں بیان کیا ہے اور ان کے یہ الفاظ اس بحث کے لیے ایک اچھا مدخل ہیں:

> "زمانے کے متعلق ہمارا گمان ہے کہ یہ براہ راست استمراری طور پر لگاتار گزر رہا ہے مگر جب ہم اس لگاتار استمراری طور پر گزرنے والے زمانے کے سیلان یا بہاؤ کو سمجھنا چاہتے ہیں تو اپنے آپ کو مشکلات سے دوچار پاتے ہیں۔ مثلاً ماضی حال اور مستقبل میں منقسم ہے ماضی گزرا ہوا زمانہ ہے مستقبل آنے والا اور حال وہ زمانہ ہے جو اب موجود ہے مگر جوں ہی ہم اس موجودہ حال پر توجہ مرکوز کرتے ہیں تو یہ گزر کر ماضی میں چلا جاتا ہے۔"[7]

جدید دور میں وقت اور مکان کی بحث نے دو بڑے رخ اختیار کیے۔ ایک رخ طبیعیات کا تھا۔ آئزک نیوٹن (Isaac Newton) نے مطلق وقت اور مطلق مکان کا تصور پیش کیا، یعنی ایک ایسا وقت جو کسی خارجی شے سے تعلق کے بغیر یکساں رفتار سے بہتا ہے اور ایک ایسا مکان جو ہمیشہ یکساں اور غیر متحرک رہتا ہے[8]۔ ایمانوئل کانٹ (Immanuel Kant) نے اس بحث کو ایک نیا موڑ دیا اور کہا کہ وقت اور مکان اشیا کی صفات نہیں بلکہ انسانی ادراک کی پیشگی صورتیں ہیں جن کے بغیر کوئی تجربہ ممکن نہیں[9]۔ بیسویں صدی کے آغاز میں آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت نے نیوٹن کے مطلق وقت کو ختم کر دیا۔ ہرمن منکوفسکی (Hermann Minkowski) نے اسی نظریے کی ریاضیاتی تعبیر کرتے ہوئے 1908ء میں یہ مشہور بات کہی:

> "Henceforth space by itself, and time by itself, are doomed to fade away into mere shadows, and only a kind of union of the two will preserve an independent reality."[10]

یہ جملہ ادب کے طالب علم کے لیے بھی اہم ہے، کیونکہ اس نے زمان و مکاں کو ایک وحدت کے طور پر دیکھنے کا جو تصور دیا وہی چند دہائیوں بعد ادبی نظریے میں کرونوٹوپ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ دوسرا رخ انسانی تجربے کا تھا۔ ہنری برگساں (Henri Bergson) نے گھڑی کے وقت اور شعور کے وقت میں فرق کیا۔ ان کے نزدیک گھڑی کا وقت دراصل مکان کی زبان میں بیان کیا گیا

وقت ہے جسے برابر ٹکڑوں میں بانٹ دیا گیا ہے، جبکہ شعور کا وقت ایک "خالص دوران" ہے جس میں ہر لمحہ پچھلے لمحے میں گھلا ہوا ہوتا ہے[11]۔ مارٹن ہائیڈیگر (Martin Heidegger) نے اس سے آگے بڑھ کر وقت کو انسانی وجود کی بنیادی ساخت قرار دیا اور کہا کہ انسان اپنی موت کے شعور کے ذریعے ہی اپنے وقت کو ایک کل کے طور پر سمجھتا ہے[12]۔

علامہ اقبال نے ان دونوں رخوں کو اسلامی فکر کے ساتھ مکالمے میں رکھا۔ اپنے خطبات کے دوسرے خطبے میں انھوں نے "مسلسل وقت" اور "خالص دوران" کا فرق بیان کیا اور یہ خیال پیش کیا کہ انسانی خودی اپنے گہرے درجے میں مسلسل وقت کی قید سے آزاد ہو کر ایک تخلیقی حال میں جیتی ہے[13]۔ یہی فکر ان کی شاعری میں "مسجدِ قرطبہ" کی صورت میں ڈھلی جہاں وقت ایک طرف فنا کی قوت ہے اور دوسری طرف زندگی کا سرچشمہ:

سلسلۂ روز و شب نقش گرِ حادثات

سلسلۂ روز و شب اصلِ حیات و ممات[14]

مکان کی بحث نسبتاً دیر سے ادبی تنقید کا حصہ بنی، مگر جب بنی تو اس نے بہت جلد اپنی جگہ بنا لی۔ میشل فوکو () (Michel Foucault) نے 1967ء کے ایک لیکچر میں کہا تھا کہ موجودہ عہد شاید سب سے بڑھ کر مکان کا عہد ہو گا[15]۔ اس کے بعد کی دہائیوں میں انسانی جغرافیے، سماجیات اور فلسفے سے مکان کے کئی تصورات ادب میں آئے۔ چینی نژاد امریکی جغرافیہ دان یی فو توان () (Yi-Fu Tuan) نے "فضا" اور "مقام" میں فرق کیا اور لکھا:

> "What begins as undifferentiated space becomes place as we get to know it better and endow it with value."[16]

توان کے نزدیک فضا حرکت اور آزادی ہے اور مقام ٹھہراؤ اور تحفظ، اس لیے جہاں انسان رک کر کسی جگہ کو معنی دیتا ہے وہیں مقام پیدا ہوتا ہے۔ گاستوں باشلار (Gaston Bachelard) نے گھر کو اس کی سب سے گہری صورت میں دیکھا۔ ان کے نزدیک گھر خوابوں کو پناہ دیتا ہے اور خواب دیکھنے والے کی حفاظت کرتا ہے، اس لیے ہماری یادیں اور تخیلات اکثر کسی مکان کے کمروں، زینوں اور کونوں سے وابستہ ہوتے ہیں[17]۔ ہنری لیفیبور (Henri Lefebvre) ے مکان کو ایک سماجی پیداوار کہا[18]، یعنی ہر معاشرہ اپنی معیشت، طاقت اور رسوم کے مطابق اپنا مکان بناتا ہے اور یہ مکان پھر اسی معاشرے کی ترتیب کو برقرار رکھتا ہے۔ فوکو نے "دیگر مقامات" یعنی ہیٹروٹوپیا کا تصور دیا جن میں قبرستان، قید خانہ، باغ، کشتی اور عبادت گاہ شامل ہیں، ایسے مقامات جو عام سماجی مکان کے اندر رہتے ہوئے بھی اس سے مختلف قوانین کے تحت چلتے ہیں اور جن کا وقت بھی عام وقت سے مختلف ہوتا ہے[19]۔

ان مباحث کو سامنے رکھا جائے تو زمان و مکاں کی کم از کم پانچ جہات واضح ہوتی ہیں جو ادب کے مطالعے کے لیے کارآمد ہیں۔ پہلی جہت طبیعی یا کائناتی ہے جس میں وقت اور مکان فطرت کے نظام کا حصہ ہیں۔ دوسری جہت نفسیاتی ہے جس میں وقت شعور، یاد اور توقع کا تجربہ ہے اور مکان احساس اور وابستگی کا۔ تیسری جہت سماجی اور تاریخی ہے جس میں وقت مزدوری، کیلنڈر، تہواروں اور سیاسی واقعات سے بنتا ہے اور مکان طبقے، طاقت اور ملکیت سے۔ چوتھی جہت مقدس یا مابعد الطبیعیاتی ہے جس میں وقت عبادت، رسم اور ابدیت سے جڑتا ہے۔ میرچا ایلیاڈ (Mircea Eliade) نے دکھایا ہے کہ قدیم انسان مقدس وقت کو ایک ایسا وقت سمجھتا تھا جو گزرتا نہیں بلکہ ہر رسم میں دوبارہ حاضر ہو جاتا ہے[20]۔ پانچویں جہت فنی یا بیانیاتی ہے، یعنی وہ وقت اور مکان جو فن پارے کے اندر تخلیق ہوتے ہیں۔ ادب کا نقاد ان پانچوں جہات سے واسطہ رکھتا ہے، مگر اس کا اصل میدان پانچویں جہت ہے جس کے ذریعے باقی چار جہات متن میں داخل ہوتی ہیں۔

ادب اور وقت کا رشتہ ادب کی ہیئت ہی سے شروع ہوتا ہے۔ جرمن نقاد لیسنگ (Gotthold Ephraim Lessing) نے 1766ء میں اپنی کتاب لاؤکون میں شاعری اور مصوری کا فرق یہ بتایا تھا کہ مصوری اپنی اشکال اور رنگوں کو مکان میں ساتھ ساتھ رکھتی ہے، اس لیے وہ ایک لمحے کو پیش کرنے کا فن ہے، جبکہ شاعری کے الفاظ وقت میں ایک کے بعد ایک آتے ہیں، اس لیے وہ عمل اور واقعے کو پیش کرنے کا فن ہے[21]۔ یہ تقسیم دو صدیوں تک ادبی نظریے میں اثر انداز رہی۔ بیسویں صدی میں امریکی نقاد جوزف فرینک (Joseph Frank) نے یہ دکھایا کہ جدید ادب، خاص طور پر جوائس اور ایلیٹ کے ہاں، زبان کی زمانی ترتیب کو توڑ کر ایک "مکانی ہیئت" پیدا کرتا ہے جس میں قاری کو متن کے مختلف ٹکڑوں کو ایک ساتھ ذہن میں رکھ کر معنی تک پہنچنا پڑتا ہے[22]۔ لیسنگ اور فرینک کے درمیان کا یہ فاصلہ ہی ادب اور زمان و مکاں کے رشتے کی پیچیدگی کو ظاہر کرتا ہے۔ ادب وقت میں پڑھا جاتا ہے مگر وہ مکان بھی تخلیق کرتا ہے، اور کبھی کبھی وہ وقت کو اس طرح منجمد کر دیتا ہے کہ وہ ایک تصویر بن جائے۔

فکشن کے حوالے سے یہ رشتہ اور بھی واضح ہے۔ ای ایم فورسٹر (E. M. Forster) نے کہانی کو واقعات کے ایسے بیان سے تعبیر کیا تھا جو ان کی زمانی ترتیب کے مطابق ہو، اور پلاٹ کو ایسے بیان سے جس میں علت و معلول کا رشتہ اہم ہو[23]۔ اے اے مینڈیلو (A. A. Mendilow) نے ناول کو بنیادی طور پر ایک زمانی فن کہا اور یہ دکھایا کہ ناول نگار کا اصل مسئلہ قاری کے وقت، راوی کے وقت اور کرداروں کے وقت کے درمیان رشتہ قائم کرنا ہے[24]۔ پال ریکور (Paul Ricoeur) نے اس بحث کو ایک فلسفیانہ نتیجے تک پہنچایا۔ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ وقت انسانی تجربہ اسی وقت بنتا ہے جب وہ کسی بیانیے کی صورت میں ترتیب پائے، اور بیانیہ اپنی معنویت اسی وقت حاصل کرتا ہے جب وہ وقت کے تجربے کو پیش کرے[25]۔ اس لحاظ سے کہانی سنانا وقت کو سمجھنے کا ایک طریقہ ہے، اور ہر ناول، افسانہ یا داستان وقت کے بارے میں ایک خاموش فلسفہ رکھتی ہے۔

AL-AASAR Journal
Quarterly Research Journal
www. al-aasar.com
Vol. 3, No.1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

زمان و مکاں کی وحدت کو ادبی نظریے میں سب سے جامع صورت روسی مفکر میخائل باختن (M. M. Bakhtin) نے دی۔ انھوں نے منکوفسکی اور آئن سٹائن کی اصطلاح سے "کرونوٹوپ" کا لفظ لیا اور اس کی تعریف یوں کی:

"We will give the name chronotope (literally, 'time space') to the intrinsic connectedness of temporal and spatial relationships that are artistically expressed in literature."[26]

باختن کے نزدیک ادب میں وقت گاڑھا ہو کر جسم اختیار کرتا ہے اور مکان وقت، پلاٹ اور تاریخ کی حرکت سے متحرک ہو جاتا ہے[27]۔ انھوں نے یونانی رومانس کے "مہماتی وقت"، سڑک اور راستے، قلعے، ڈرائنگ روم، صوبائی قصبے اور دہلیز جیسے کرونوٹوپ شناخت کیے اور بتایا کہ ہر کرونوٹوپ اپنے ساتھ انسان کا ایک خاص تصور لاتا ہے۔ سڑک پر ملنے والے انسان اتفاق اور تقدیر کے تابع ہیں، دہلیز پر کھڑا انسان بحران اور فیصلے کے لمحے میں ہے، اور دیہی خوشحالی کے کرونوٹوپ میں انسان نسل در نسل ایک ہی جگہ سے بندھا ہوا ہے۔ کرونوٹوپ کا تصور اس لیے اہم ہے کہ اس نے وقت اور مکان کو دو الگ موضوعات کے بجائے متن کی ایک بنیادی ساخت کے طور پر دیکھنا ممکن بنایا۔

اردو ادب کی روایت میں اس انسلاک کی مثالیں ہر صنف میں مل جاتی ہیں۔ داستان کا وقت ایک طلسمی وقت ہے جس میں برس لمحوں میں اور لمحے برسوں میں بدل جاتے ہیں اور اس کا مکان ایک ایسا نقشہ ہے جس میں کوہِ قاف اور بصرہ ساتھ ساتھ موجود ہیں۔ میر امن کی باغ و بہار میں چار درویش ایک ہی رات میں اپنی عمروں کی داستانیں سناتے ہیں، یعنی کہانی سنانے کا ایک مختصر وقت برسوں کے واقعات کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے[28]۔ غزل میں وقت اکثر ایک لمحے میں سمٹ جاتا ہے اور مکان ایک علامت بن جاتا ہے۔ غالب کا یہ شعر مکان اور امکان کو ایک ہی تصویر میں جمع کر دیتا ہے:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا[29]

یہاں "دشت" ایک مکان ہے مگر یہ مکان جغرافیے کا نہیں، امکان کا ہے۔ تمنا اتنی وسیع ہے کہ پورا دشتِ امکاں اس کے ایک قدم میں سما گیا۔ وزیر آغا نے اردو شاعری کے مزاج پر لکھتے ہوئے اس بات کی نشاندہی کی تھی کہ ہماری شاعری کے بنیادی رویے زمین اور وقت کے ساتھ انسان کے رشتے سے متعین ہوئے ہیں[30]۔ یہ مشاہدہ اس بات کی تائید کرتا ہے کہ اردو ادب میں زمان و مکاں کوئی درآمد شدہ موضوع نہیں بلکہ اس کی تخلیقی روایت کا حصہ ہے۔

تخلیق کار زمان و مکاں کو کئی سطحوں پر برتتا ہے۔ پہلی سطح وہ ہے جس پر وقت اور مکان کہانی کا پس منظر فراہم کرتے ہیں۔ یہ سب سے سادہ صورت ہے، مگر اس میں بھی انتخاب کا عمل شامل ہے۔ کوئی ناول نگار اپنی کہانی کو 1857ء کی دلی میں رکھتا ہے اور کوئی

Vol. 3, No.1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

1947ء کے لاہور میں، اور یہ انتخاب خود ایک معنی رکھتا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کا ابن الوقت اس کی ایک مثال ہے۔ ناول کا عنوان ہی وقت سے جڑا ہوا ہے اور اس کا مرکزی کردار 1857ء کے بعد کی دلی میں پرانی تہذیب اور انگریزی طرزِ زندگی کے درمیان کھڑا ہے[31]۔ یہاں وقت دو زمانوں کا تصادم ہے اور مکان ایک ایسا شہر ہے جو حاکم اور محکوم کی دو دنیاؤں میں بٹا ہوا ہے۔ باختن کی اصطلاح میں ابن الوقت کا کرونوٹوپ دہلیز کا کرونوٹوپ ہے۔

دوسری سطح وہ ہے جس پر تخلیق کار وقت کی ترتیب اور رفتار سے کھیلتا ہے۔ وہ کسی واقعے کو پہلے بیان کر سکتا ہے اور اس کے سبب کو بعد میں، کسی لمحے کو کئی صفحات میں پھیلا سکتا ہے اور کئی برسوں کو ایک جملے میں سمیٹ سکتا ہے۔ فرانسیسی نقاد ژیرار ژینیت (Gérard Genette) نے اس کھیل کو باقاعدہ زمروں میں تقسیم کیا۔ انھوں نے ترتیب، دورانیہ اور تکرار کے تین بنیادی زمرے قائم کیے[32]۔ ترتیب کے تحت ماضی کی طرف رجعت اور مستقبل کی طرف پیش بینی آتی ہیں، دورانیے کے تحت منظر، خلاصہ، وقفہ اور حذف جیسی رفتاریں اور تکرار کے تحت یہ سوال کہ کوئی واقعہ جتنی بار ہوا اتنی بار بیان ہوا یا کم زیادہ۔ ان زمروں کی مدد سے یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ کوئی تخلیق کار کن باتوں پر ٹھہرتا ہے اور کن سے جلدی گزر جاتا ہے، اور یہ ٹھہراؤ اس کی ترجیحات کو ظاہر کرتا ہے۔

قرۃ العین حیدر کا آگ کا دریا اردو میں وقت کے ساتھ اس کھیل کی سب سے نمایاں مثال ہے[33]۔ یہ ناول چندر گپت موریہ کے عہد سے شروع ہو کر مسلم سلطنتوں، مغلوں، نو آبادیاتی دور اور تقسیم کے بعد تک پہنچتا ہے، اور اس طویل سفر میں گوتم نیلمبر، کمال اور چمپا جیسے نام مختلف زمانوں میں بار بار لوٹتے ہیں۔ یوں کردار ایک فرد نہیں رہتے بلکہ ایک تہذیبی تسلسل کے نمائندے بن جاتے ہیں جو صدیوں پر پھیلا ہوا ہے۔ دریا اس ناول کا مرکزی مکانی استعارہ ہے جس کے کنارے زمانے آتے اور گزرتے ہیں مگر جو خود بہتا رہتا ہے۔ یہاں تخلیق کار نے وقت کو ایک تاریخی لکیر کے بجائے ایک دائرے کی صورت میں برتا ہے جس میں ماضی ختم نہیں ہوتا بلکہ نئی صورتوں میں لوٹتا رہتا ہے۔

تیسری سطح وہ ہے جس پر وقت کردار کے شعور کا تجربہ بن جاتا ہے۔ یہاں ناول نگار گھڑی کے وقت کے بجائے اس وقت کو پیش کرتا ہے جو کردار کے ذہن میں گزرتا ہے، اور یہ وقت یاد، خواب اور توقع کے درمیان مسلسل آگے پیچھے ہوتا رہتا ہے۔ ڈاکٹر ناہید قمر نے اسی تکنیک کو شعور کی رو سے جوڑا ہے جس میں کہانی خطِ مستقیم پر آگے بڑھنے کے بجائے ایک ایسے دائرے میں چلتی ہے جہاں ماضی، حال اور مستقبل ذہنی کیفیات بن جاتے ہیں[34]۔ انتظار حسین کا ناول بستی اس کی ایک عمدہ مثال ہے جس میں مرکزی کردار ذاکر 1971ء کے سانحے کے دنوں میں بیٹھا اپنے بچپن کی روپ نگر کی بستی، ہجرت اور اساطیری زمانوں کو یاد کرتا ہے[35]۔ اس ناول کا حال ایک ٹوٹتے ہوئے ملک کا حال ہے، مگر اس کا اصل وقت یاد کا وقت ہے جو حال کے بحران کو ماضی کے کئی بحرانوں کے ساتھ جوڑ دیتا ہے۔

چوتھی سطح وہ ہے جس پر مکان ایک فعال قوت بن جاتا ہے۔ یہاں جگہ صرف وہ جگہ نہیں جہاں واقعات ہوتے ہیں، وہ خود کرداروں کی تقدیر میں شریک ہو جاتی ہے۔ شوکت صدیقی کے ناول خدا کی بستی میں بڑے شہر کی کچی بستیاں اور سڑکیں اسی طرح کرداروں کو گھیرے ہوئے ہیں[36]۔ یہ جگہیں لیفیبور کے سماجی مکان کی مثال ہیں جنھیں معیشت اور طبقے نے تشکیل دیا ہے، اور ان میں رہنے والے اپنی محنت کے باوجود اس دائرے سے نکل نہیں پاتے۔ مستنصر حسین تارڑ کے ناول بہاؤ میں ایک قدیم دریا کا سوکھنا ایک پوری تہذیب کے خاتمے کی علامت بن جاتا ہے[37]۔ دریا کے سکڑنے کے ساتھ بستی کے لوگوں کا وقت بھی سکڑتا ہے، اور کچھ کردار جگہ چھوڑ دیتے ہیں جبکہ کچھ اپنی زمین سے لپٹے رہتے ہیں۔ یہاں مکان کا سوال وجود کا سوال بن جاتا ہے۔

پانچویں سطح وہ ہے جس پر تخلیق کار زمان و مکاں کو ایک علامتی کل میں ڈھال دیتا ہے۔ یہ صورت عموماً مختصر متون میں زیادہ نمایاں ہوتی ہے جہاں ایک ہی تصویر پورے متن کا مرکز ہوتی ہے۔ سعادت حسن منٹو کا افسانہ ٹوبہ ٹیک سنگھ اس کی ایک ایسی مثال ہے جسے اگلے حصے میں تنقیدی اطلاق کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ یہاں صرف یہ کہنا کافی ہے کہ اس افسانے کا عنوان ایک جگہ کا نام ہے جو ایک انسان کا نام بھی بن جاتا ہے، اور یہی دوہرا پن افسانے کے پورے زمانی اور مکانی تصور کی کنجی ہے۔

ان سطحوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے بیان کرنا تجزیے کی سہولت کے لیے ہے۔ کسی بڑے متن میں یہ سب سطحیں ایک ساتھ موجود ہوتی ہیں۔ آگ کا دریا میں تاریخی پس منظر بھی ہے، ترتیب کا کھیل بھی، کرداروں کا داخلی وقت بھی، دریا کا فعال مکان بھی اور ایک علامتی کل بھی۔ تخلیق کار کی مہارت اسی میں ہے کہ وہ ان سطحوں کو کس طرح ایک دوسرے سے جوڑتا ہے۔ نقاد کا کام یہ ہے کہ وہ انھیں الگ الگ پہچانے اور پھر ان کے رشتے کو سمجھے۔

زمان و مکاں کے تنقیدی مطالعے کا سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ وہ یا تو محض موضوعاتی تبصرہ بن جائے یا نظریات کی ایک فہرست جسے متن پر باہر سے چسپاں کر دیا جائے۔ پہلی صورت میں نقاد صرف یہ بتاتا ہے کہ متن میں وقت کا ذکر کہاں کہاں آیا ہے، اور دوسری صورت میں وہ متن کو کسی نظریے کی مثال بنا دیتا ہے۔ ان دونوں سے بچنے کے لیے ایک ایسا طریقِ کار درکار ہے جو متن کی شہادت سے شروع ہو اور مرحلہ وار اس کے زمانی اور مکانی ڈھانچے تک پہنچے۔ اس مقالے میں ایسا ہی ایک پانچ سطحی طریقِ کار تجویز کیا گیا ہے جس کی بنیاد ژینیت کی بیانیات، باختن کے کرونوٹوپ اور مکان کے جدید نظریات پر ہے۔

پہلی سطح قصے کے زمان اور بیان کے زمان کی ہے۔ یہاں دو سوال پوچھے جاتے ہیں: کہانی کے واقعات کتنے عرصے پر پھیلے ہوئے ہیں، اور راوی کس زمانی مقام سے انھیں سنا رہا ہے۔ کوئی راوی واقعات کے ساتھ ساتھ چل رہا ہوتا ہے، کوئی ان کے ختم ہونے کے برسوں بعد انھیں یاد کر رہا ہوتا ہے۔ یہ فاصلہ متن کے لہجے کو متعین کرتا ہے۔ قریب کا راوی گواہ ہوتا ہے، دور کا راوی منصف یا معترف۔

Vol. 3, No.1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

دوسری سطح ترتیب اور رفتار کی ہے۔ یہاں ژینیت کے زمروں کی مدد سے دیکھا جاتا ہے کہ واقعات کس ترتیب سے بیان ہوئے ہیں، کہاں ماضی کی طرف رجعت ہے اور کہاں مستقبل کی طرف اشارہ، کن لمحوں پر بیانیہ ٹھہرتا ہے اور کن برسوں کو وہ حذف کر دیتا ہے۔ یہ سطح اس لیے اہم ہے کہ متن کی ترجیحات اکثر اس کے ٹھہراؤ میں چھپی ہوتی ہیں۔

تیسری سطح وقت کی نوعیت کی ہے۔ یہاں یہ طے کیا جاتا ہے کہ متن میں وقت خطی ہے یا دائروی، سماجی ہے یا داخلی، تاریخی ہے یا مقدس، اور یہ کہ کیا متن میں وقت کی ایک سے زیادہ صورتیں آپس میں ٹکراتی ہیں۔ اس سطح پر برگساں کا دوران، ایلیاڈ کا مقدس وقت اور صدمے سے متعلق جدید مباحث مددگار ہوسکتے ہیں۔ کیتھی کیروتھ (Cathy Caruth) کے مطابق صدمہ اپنے وقوع کے لمحے میں پوری طرح تجربہ نہیں ہوتا اور اسی لیے بعد میں بار بار لوٹتا ہے[38]۔ یہ نکتہ تقسیم اور ہجرت سے متعلق اردو متون کے لیے خاص طور پر اہم ہے۔

چوتھی سطح مکان کی پرتوں کی ہے۔ یہاں متن کے مقامات کی فہرست بنائی جاتی ہے اور پھر ان کی نوعیت دیکھی جاتی ہے: کون سی جگہ مقام ہے اور کون سی محض فضا، کون سی جگہ سماجی طاقت کی پیداوار ہے، کون سا مکان گھر کی طرح یادوں کا امین ہے اور کون سا ہیٹروٹوپیا کی طرح عام دنیا سے الگ قوانین رکھتا ہے۔ اس سطح پر گیبریل زوران(Gabriel Zoran) کا یہ نکتہ بھی مفید ہے کہ بیانیے میں مکان کئی درجوں پر بنتا ہے، کچھ براہِ راست بیان سے، کچھ واقعات کی حرکت سے اور کچھ متن کی مجموعی ساخت سے[39]۔

پانچویں سطح کرونوٹوپ کی ہے۔ یہاں پہلی چار سطحوں کے نتائج کو جمع کر کے یہ سوال پوچھا جاتا ہے کہ متن میں زمان اور مکان مل کر کون سی بنیادی صورت بناتے ہیں اور یہ صورت انسان کے بارے میں کیا کہتی ہے۔ یہ سطح تجزیے کی تکمیل ہے کیونکہ یہیں متن کا زمانی اور مکانی ڈھانچہ اس کے معنی سے جڑتا ہے۔

اس طریقِ کار کو آزمانے کے لیے منٹو کا افسانہ ٹوبہ ٹیک سنگھ موزوں ہے، کیونکہ یہ مختصر ہے، معروف ہے اور زمان و مکاں کا سوال اس کی بنیاد میں موجود ہے[40]۔ افسانے کا قصہ تقسیم کے دو تین سال بعد کا ہے جب دونوں ملکوں کی حکومتوں نے پاگلوں کے تبادلے کا فیصلہ کیا۔ لاہور کے پاگل خانے میں بشن سنگھ نامی ایک سکھ پندرہ برس سے بند ہے جو نہ بیٹھتا ہے نہ لیٹتا ہے اور ایک بے معنی جملہ دہراتا رہتا ہے جس کے آخر میں "ٹوبہ ٹیک سنگھ" کا نام آتا ہے۔ اسے صرف یہ جاننا ہے کہ اس کا گاؤں ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے، ہندوستان میں یا پاکستان میں۔ کوئی اسے یہ نہیں بتا پاتا۔ تبادلے کے دن وہ سرحد پر جانے سے انکار کر دیتا ہے اور آخرکار دونوں سرحدوں کے درمیان گر پڑتا ہے۔

پہلی سطح پر دیکھا جائے تو قصے کا زمان چند مہینوں کا ہے مگر بشن سنگھ کے ذریعے اس میں پندرہ برس کا وقت بھی شامل ہے جو اس نے کھڑے کھڑے گزارا۔ راوی ایک ایسے فاصلے پر ہے جو واقعات کا ہم عصر ہے اور اس کا لہجہ ایک خشک، طنزیہ اور بظاہر غیر جذباتی

گواہ کا ہے۔ یہی لہجہ افسانے کی سب سے بڑی قوت ہے کیونکہ پاگلوں کی باتیں سنجیدگی سے بیان کر کے وہ عقل مندوں کے فیصلے کی بے معنویت کو ظاہر کر دیتا ہے۔

دوسری سطح پر افسانے کی ترتیب خطی ہے مگر اس کی رفتار غیر متوازن ہے۔ تقسیم کا بڑا تاریخی واقعہ چند جملوں میں خلاصے کی صورت میں آتا ہے جبکہ پاگلوں کی گفتگو، ان کی الجھنیں اور بشن سنگھ کے سوال مفصل مناظر میں بیان ہوتے ہیں۔ تکرار کا عنصر بھی نمایاں ہے۔ بشن سنگھ کا بے معنی جملہ بار بار دہرایا جاتا ہے اور ہر بار اس میں ایک نیا لفظ جڑ جاتا ہے۔ یہ تکرار ایک ایسے وقت کی علامت ہے جو آگے نہیں بڑھتا، ایک ہی سوال کے گرد گھومتا رہتا ہے۔

تیسری سطح پر افسانے میں وقت کی دو صورتیں ٹکراتی ہیں۔ ایک ریاست کا تاریخی وقت ہے جو ایک تاریخ مقرر کرتا ہے اور اس تاریخ کے بعد لوگوں کو ایک ملک سے دوسرے ملک منتقل کر دیتا ہے۔ دوسرا بشن سنگھ کا ٹھہرا ہوا وقت ہے جو پندرہ برس سے اپنی جگہ کھڑا ہے۔ ریاست کا وقت فیصلہ کن اور تیز ہے، بشن سنگھ کا وقت جامد اور ضدی۔ کیروتھ کے تصور کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ تقسیم کا صدمہ یہاں ایک ایسے شخص میں مجسم ہو گیا ہے جو اس واقعے کو سمجھ ہی نہیں سکتا، اور اسی لیے وہ اسے قبول بھی نہیں کر پاتا۔

چوتھی سطح پر افسانے کا مکان تین پرتوں میں ہے۔ پہلی پرت پاگل خانہ ہے جو فوکو کے ہیٹروٹوپیا کی واضح مثال ہے۔ یہ معاشرے کے اندر ایک ایسی جگہ ہے جہاں اسے الگ رکھا جاتا ہے جسے معاشرہ برداشت نہیں کر سکتا، مگر افسانے میں یہی جگہ باہر کی دنیا کی دیوانگی کو سب سے واضح طور پر دکھاتی ہے۔ دوسری پرت ٹوبہ ٹیک سنگھ کا گاؤں ہے جو تو ان کے معنی میں ایک مقام ہے، ایک ایسی جگہ جس سے بشن سنگھ کی شناخت جڑی ہوئی ہے۔ تیسری پرت سرحد ہے جو نئی ریاستوں نے کھینچی اور جس نے گاؤں کو ایک نقشے کا سوال بنا دیا۔ ایڈورڈ سعید (Edward W. Said) نے جلاوطنی کو ایک ایسے زخم سے تعبیر کیا ہے جو انسان اور اس کی آبائی جگہ کے درمیان پیدا ہوتا ہے اور کبھی پوری طرح نہیں بھرتا[41]۔ بشن سنگھ کا زخم یہی ہے، اس سے اس کی جگہ کا نام تو نہیں چھینا گیا مگر اس نام کا ملک بدل دیا گیا۔ افسانے کا اختتام ان تینوں پرتوں کو ایک ہی تصویر میں جمع کر دیتا ہے:

"ادھر خار دار تاروں کے پیچھے ہندوستان تھا۔۔۔ ادھر ویسے ہی تاروں کے پیچھے پاکستان۔ درمیان میں زمین کے اس ٹکڑے پر جس کا کوئی نام نہیں تھا، ٹوبہ ٹیک سنگھ پڑا تھا۔"[42]

پانچویں سطح پر اس افسانے کا کرونوٹوپ "بے نام زمین" کا کرونوٹوپ ہے۔ یہ باختن کی دہلیز کی ایک انتہائی صورت ہے۔ دہلیز پر کھڑا انسان کسی نہ کسی طرف جاتا ہے، مگر بشن سنگھ دہلیز ہی پر گر پڑتا ہے اور وہیں رہ جاتا ہے۔ یہاں وقت ختم ہو جاتا ہے اور مکان بے نام ہو جاتا ہے۔ اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ آخری جملے میں "ٹوبہ ٹیک سنگھ" ایک گاؤں کا نام نہیں رہتا بلکہ ایک آدمی کا نام بن جاتا

ہے جو زمین کے اس ٹکڑے پر پڑا ہے۔ انسان اور جگہ ایک ہو گئے ہیں، اور جس جگہ کا کوئی نام نہیں اسے اس انسان نے نام دے دیا ہے۔ یہ منٹو کا وہ جواب ہے جو اس نے سرحد کھینچنے والوں کو دیا: جگہ نقشے سے نہیں، انسان سے بنتی ہے۔

یہ مختصر اطلاق دکھاتا ہے کہ پانچ سطحی طریقِ کار کسی متن کے معنی کو اس کی ساخت کے اندر سے دریافت کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اگر ٹوبہ ٹیک سنگھ کو صرف موضوعاتی زاویے سے پڑھا جائے تو یہ تقسیم کی بے معنویت پر ایک طنز ہے۔ جب اس کے زمان و مکاں کی سطحوں کو الگ الگ دیکھا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ منٹو نے یہ طنز کس فنی تدبیر سے پیدا کیا: ریاست کے تیز وقت اور پاگل کے ٹھہرے ہوئے وقت کا ٹکراؤ، پاگل خانے کو عقل کی جگہ بنا دینا، اور آخر میں جگہ اور انسان کو ایک کر دینا۔ اس طرح فکری معنی اور فنی ترتیب ایک دوسرے سے جدا نہیں رہتے۔

یہی طریقِ کار شاعری پر بھی آزمایا جا سکتا ہے، اگرچہ وہاں اس کی صورت کچھ بدل جاتی ہے کیونکہ نظم میں قصہ کم اور تصویر زیادہ ہوتی ہے۔ اقبال کی نظم مسجدِ قرطبہ اس کی ایک اچھی مثال ہے۔ نظم کا آغاز وقت کی اس قوت سے ہوتا ہے جو ہر شے کو فنا کر دیتی ہے، یعنی سلسلۂ روز و شب جو حادثات کا نقش گر ہے۔ یہ خطی اور بے رحم وقت ہے جس کے سامنے ہر نقش ناپائیدار ہے۔ اس کے بعد نظم ایک مکان کی طرف مڑتی ہے، یعنی قرطبہ کی مسجد، اور یہاں وقت کا ایک دوسرا تصور سامنے آتا ہے:

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام[43]

یہاں مکان وقت پر غالب آ گیا ہے، مگر یہ غلبہ پتھر کا نہیں، اس عشق کا ہے جس نے اس عمارت کو تخلیق کیا۔ ایلیاڈ کی اصطلاح میں مسجد ایک مقدس مکان ہے جو عام دنیوی مکان سے الگ ہے اور جس میں داخل ہو کر انسان ایک دوسرے وقت میں پہنچ جاتا ہے۔ نظم کے آخری حصے میں شاعر دریائے کبیر کے کنارے کھڑا ہے اور وقت ایک بار پھر حرکت میں آتا ہے، مگر اس بار اس کی سمت مستقبل کی طرف ہے:

آبِ روانِ کبیر! تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب[44]

اس نظم کا کرونوٹوپ مقدس عمارت اور بہتے دریا کا کرونوٹوپ ہے۔ عمارت دوام کی علامت ہے اور دریا تغیر کی، اور شاعر ان دونوں کے درمیان کھڑا ہو کر ماضی کی عظمت سے مستقبل کا خواب کشید کرتا ہے۔ یوں پانچ سطحی طریقِ کار نظم پر بھی کام کرتا ہے، فرق صرف یہ ہے کہ یہاں قصے اور بیان کے زمان کے بجائے شاعر کے حال اور تاریخ کے ماضی کا رشتہ اہم ہو جاتا ہے، اور ترتیب اور رفتار

کے بجائے نظم کے بندوں کی حرکت، جو فنا سے دوام اور دوام سے امکان کی طرف جاتی ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ زمان و مکاں کا تجزیہ کسی ایک صنف تک محدود نہیں اور ہر صنف اپنی ہیئت کے مطابق اس کے لیے اپنی راہ نکالتی ہے۔

قاری کا وقت بھی اس بحث کا ایک پہلو ہے جسے عموماً نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ایک ناول جو چند گھنٹوں میں پڑھا جاتا ہے، صدیوں کا قصہ سنا سکتا ہے، اور ایک افسانہ جو دس منٹ میں ختم ہو جاتا ہے، قاری کے ذہن میں برسوں تک باقی رہ سکتا ہے۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ کا آخری جملہ پڑھتے ہوئے قاری جس ٹھہراؤ کا تجربہ کرتا ہے وہ افسانے کے اندر کے ٹھہراؤ سے ملتا ہے۔ اسی طرح آگ کا دریا کی طوالت خود قاری کو ایک طویل زمانی سفر کا تجربہ کراتی ہے۔ متن کا وقت، راوی کا وقت اور قاری کا وقت، یہ تینوں مل کر ادبی تجربے کو زمانی تجربہ بناتے ہیں، اور نقاد کو اپنے تجزیے میں اس تیسرے وقت کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔

زمان و مکاں کا یہ زاویۂ مطالعہ اردو تحقیق کے لیے کئی نئے راستے کھولتا ہے۔ پہلا راستہ یادداشت کے مطالعے کا ہے۔ فرانسیسی مورخ پیئر نورا(Pierre Nora) نے "یادداشت کے مقامات" کا تصور پیش کیا، یعنی وہ جگہیں، یادگاریں، رسوم اور علامتیں جن میں ایک قوم کی یاد اس وقت مجسم ہو جاتی ہے جب زندہ یادداشت کا ماحول ختم ہونے لگتا ہے[45]۔ اردو ادب میں دلی، لکھنؤ، کربلا، امرتسر، لاہور اور کراچی جیسے نام محض شہر نہیں بلکہ یادداشت کے مقامات ہیں، اور ان کا اس تناظر میں مطالعہ ہماری تہذیبی یادداشت کی تشکیل کو سمجھنے میں مدد دے سکتا ہے۔ تقسیم سے متعلق فکشن کو صدمے کے زمانی مطالعے کے ساتھ جوڑ کر پڑھنا بھی اسی راستے کا حصہ ہے۔

دوسرا راستہ تاریخی فکشن کا ہے۔ لنڈا ہچین(Linda Hutcheon) نے مابعد جدید ادب کی ایک صورت کو "تاریخ نگارانہ میٹا فکشن" کا نام دیا جس میں ناول ماضی کو ایک مکمل حقیقت کے بجائے ایک ایسے متن کے طور پر دیکھتا ہے جسے دوبارہ لکھا جا سکتا ہے[46]۔ اردو میں قدیم تہذیبوں، صوفیا کی زندگیوں اور معاصر سیاسی واقعات پر لکھے گئے ناولوں کا اس تناظر میں مطالعہ یہ دکھا سکتا ہے کہ ہمارا ناول ماضی کے ساتھ کس طرح کا رشتہ قائم کرتا ہے۔ ایلیاڈ نے جسے "تاریخ کی دہشت" کہا تھا[47]، یعنی یہ خوف کہ تاریخی واقعات دہرائے نہیں جاتے اور کھویا ہوا واپس نہیں آتا، اس کا سامنا اردو ناول نے کس طرح کیا، یہ بھی ایک اہم سوال ہے۔

تیسرا راستہ ماحولیاتی تنقید کا ہے۔ بہاؤ جیسے ناول میں دریا کا سوکھنا ایک قدیم واقعہ ہے، مگر آج کے قاری کے لیے یہ ایک معاصر خدشہ بھی ہے۔ دریا، پہاڑ، صحرا اور جنگل کو ادب میں محض منظر کے بجائے ایک ایسے مکان کے طور پر دیکھنا جس کا اپنا وقت ہے، موسموں کا وقت، فصلوں کا وقت اور ارضیاتی وقت، اردو تنقید میں ایک نسبتاً نیا میدان ہے جس پر کام کی بہت گنجائش ہے۔

چوتھا راستہ عالمگیریت اور ٹیکنالوجی کے اثرات کا ہے۔ ڈیوڈ ہاروی(David Harvey) نے جدید سرمایہ داری کے تحت "زمان و مکاں کے سکڑاؤ" کا تصور پیش کیا، یعنی یہ کہ رفتار میں اضافے کے ساتھ دنیا چھوٹی ہوتی جا رہی ہے اور وقت کا تجربہ پہلے سے زیادہ تیز اور منتشر ہو رہا ہے[48]۔ اکیسویں صدی کا اردو فکشن اس تجربے سے گزر رہا ہے۔ اس کے کردار ایک ساتھ کئی جگہوں پر موجود ہیں، ان کی

AL-AASAR Journal
Quarterly Research Journal
www. al-aasar.com

Vol. 3, No.1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

شناخت بدلتی رہتی ہے اور ان کے لیے مستقبل ایک یقینی منزل کے بجائے ایک مشکوک امکان بن گیا ہے۔ اس ادب کا مطالعہ روایتی زمانی زمروں کے ساتھ ساتھ ان نئے تجربات کو سامنے رکھ کر کیا جانا چاہیے۔

پانچواں راستہ صنفی اور سماجی مکان کا ہے۔ زنان خانہ، ڈیوڑھی، صحن اور کھڑکی جیسے مقامات اردو فکشن میں عورت کے تجربے سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ باشلار کے گھر کے تصور اور لیفیبور کے سماجی مکان کو تانیثی زاویے سے ملا کر پڑھا جائے تو یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ گھر کس کے لیے پناہ ہے اور کس کے لیے قید۔ یہ سوال اردو میں خواتین کے لکھے ہوئے فکشن کے مطالعے کو ایک نئی سمت دے سکتا ہے۔

آخر میں یہ اعتراف ضروری ہے کہ اس مقالے کی کچھ حدود ہیں۔ مغربی نظریات اردو متون کو سمجھنے میں مددگار ہیں، مگر ہر جگہ کافی نہیں۔ اسلامی تصوف کا "وقت"، جس میں صوفی کو "ابن الوقت" کہا جاتا ہے، یا داستان کا طلسمی زمان، یا غزل کا وہ لمحہ جس میں ازل اور ابد ایک ہو جاتے ہیں، ان سب کو سمجھنے کے لیے مقامی فکری روایت کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے فکشن کی تنقید میں مغربی اصولوں کی اندھی پیروی کے بجائے متن کے اپنے تقاضوں کو سامنے رکھنے پر زور دیا تھا[49]، یہ اصول زمان و مکاں کے مطالعے پر بھی صادق آتا ہے۔ اسی طرح یہاں جو مثالیں دی گئی ہیں وہ نمائندہ ہیں، جامع نہیں، اور ان کا مقصد طریقِ کار کو واضح کرنا ہے، کسی صنف یا دور کا مکمل جائزہ لینا نہیں۔

اس مطالعے سے چند نتائج سامنے آتے ہیں۔ پہلا یہ کہ زمان و مکاں کا تصور ایک اکہرا تصور نہیں۔ اس کی طبیعی، نفسیاتی، سماجی، مقدس اور فنی جہات ہیں، اور ادب کا نقاد ان سب سے واسطہ رکھتا ہے مگر اس کا اصل میدان فنی جہت ہے جس کے ذریعے باقی جہات متن میں داخل ہوتی ہیں۔ دوسرا یہ کہ ادب کا زمان و مکاں سے رشتہ اس کی ہیئت ہی میں پیوست ہے۔ لیسنگ سے فرینک تک اور فورسٹر سے ریکور تک کی بحث یہ دکھاتی ہے کہ ادب وقت میں پڑھا جاتا ہے مگر مکان بھی تخلیق کرتا ہے اور باختن کا کرونوٹوپ ان دونوں کو ایک ساخت کے طور پر دیکھنے کا سب سے مؤثر تصور ہے۔

تیسرا نتیجہ یہ ہے کہ تخلیق کار زمان و مکاں کو کم از کم پانچ سطحوں پر برتتا ہے: پس منظر کی سطح پر، ترتیب اور رفتار کی سطح پر، کردار کے شعور کی سطح پر، فعال مکان کی سطح پر اور علامتی کل کی سطح پر۔ اردو ادب میں ابن الوقت، آگ کا دریا، بستی، خدا کی بستی، بہاؤ اور ٹوبہ ٹیک سنگھ جیسے متون ان سطحوں کی واضح مثالیں فراہم کرتے ہیں۔ چوتھا نتیجہ یہ ہے کہ تنقیدی اطلاق کے لیے ایک مرحلہ وار طریقِ کار ضروری ہے جو متن کی شہادت سے شروع ہو۔ اس مقالے میں تجویز کیا گیا پانچ سطحی طریقِ کار، یعنی قصے اور بیان کا زمان، ترتیب اور رفتار، وقت کی نوعیت، مکان کی پرتیں اور کرونوٹوپ، اسی ضرورت کو پورا کرنے کی ایک کوشش ہے، اور ٹوبہ ٹیک سنگھ پر اس کا اطلاق یہ دکھاتا ہے کہ اس کے ذریعے متن کے فکری معنی اس کی فنی ترتیب کے اندر سے دریافت کیے جا سکتے ہیں۔

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com

Vol. 3, No.1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

پانچواں اور آخری نتیجہ یہ ہے کہ یہ زاویۂ نظر اردو تحقیق کے لیے یادداشت، تاریخی فکشن، ماحولیات، عالمگیریت اور صنفی مکان جیسے کئی نئے میدان کھولتا ہے۔ ان میدانوں میں کام کرتے ہوئے مغربی نظریے اور مقامی فکری روایت کو ایک دوسرے کے ساتھ مکالمے میں رکھنا ضروری ہوگا، کیونکہ اردو ادب کا زمان و مکاں ان دونوں کے سنگم پر وجود میں آیا ہے۔

حوالہ جات

---

[1] ڈاکٹر ناہید قمر، اردو فکشن میں وقت کا تصور، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۸ء)، ص ۱۱۰

[2] ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات، (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ۲۰۰۴ء)

[3] القرآن الحکیم، سورۃ العصر: ۱۔۳

[4] القرآن الحکیم، سورۃ الحج: ۴۷

[5] امام مسلم بن الحجاج، صحیح مسلم، کتاب الالفاظ من الادب وغیرہا، (لاہور: مکتبۃ الاشاعت، اردو بازار، 2007ء۔) حدیث ۲۲۴۶

[6] Augustine, *Confessions*, trans. Henry Chadwick (Oxford: Oxford University Press, 1991), bk. 11, chap. 14.

[7] عزیز احمد، ”حرکت وزماں“، مشمولہ زمان و مکاں، مرتبہ: عشرت شاہین، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء)، ص ۲۲۸

[8] Isaac Newton, *The Principia: Mathematical Principles of Natural Philosophy*, trans. I. Bernard Cohen and Anne Whitman (Berkeley: University of California Press, 1999), 408.

[9] Immanuel Kant, *Critique of Pure Reason*, trans. Paul Guyer and Allen W. Wood (Cambridge: Cambridge University Press, 1998), A24/B38.

[10] Hermann Minkowski, "Space and Time," in H. A. Lorentz et al., *The Principle of Relativity* (New York: Dover Publications, 1952), 75.

[11] Henri Bergson, *Time and Free Will: An Essay on the Immediate Data of Consciousness*, trans. F. L. Pogson (London: George Allen & Unwin, 1910), 100.

[12] Martin Heidegger, *Being and Time*, trans. John Macquarrie and Edward Robinson (London: SCM Press, 1962), §65.

[13] Muhammad Iqbal, *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, ed. M. Saeed Sheikh (Lahore: Iqbal Academy Pakistan and Institute of Islamic Culture, 1989), Lecture II.

[14] علامہ محمد اقبال، ”مسجدِ قرطبہ“، مشمولہ بالِ جبریل، (نئی دہلی: اعتقاد پبلیشنگ ہاؤس، 1981)، ص 42

[15] Michel Foucault, "Of Other Spaces," trans. Jay Miskowiec, *Diacritics* 16, no. 1 (1986): 22.

[16] Yi-Fu Tuan, *Space and Place: The Perspective of Experience* (Minneapolis: University of Minnesota Press, 1977), 6.

[17] Gaston Bachelard, *The Poetics of Space*, trans. Maria Jolas (Boston: Beacon Press, 1994), 6.

[18] Henri Lefebvre, *The Production of Space*, trans. Donald Nicholson-Smith (Oxford: Blackwell, 1991), 26.

[19] Foucault, "Of Other Spaces," 24.

[20] Mircea Eliade, *The Sacred and the Profane: The Nature of Religion*, trans. Willard R. Trask (New York: Harcourt, Brace & World, 1959), 68.

[21] Gotthold Ephraim Lessing, *Laocoön: An Essay on the Limits of Painting and Poetry*, trans. Edward Allen McCormick (Indianapolis: Bobbs-Merrill, 1962), chap. 16.

[22] Joseph Frank, "Spatial Form in Modern Literature: An Essay in Two Parts," *The Sewanee Review* 53, no. 2 (1945): 221.

[23] E. M. Forster, *Aspects of the Novel* (London: Edward Arnold, 1927).

[24] A. A. Mendilow, *Time and the Novel* (London: Peter Nevill, 1952).

[25] Paul Ricoeur, *Time and Narrative*, vol. 1, trans. Kathleen McLaughlin and David Pellauer (Chicago: University of Chicago Press, 1984), 3.

[26] M. M. Bakhtin, "Forms of Time and of the Chronotope in the Novel," in *The Dialogic Imagination: Four Essays*, ed. Michael Holquist, trans. Caryl Emerson and Michael Holquist (Austin: University of Texas Press, 1981), 84.

[27] Bakhtin, "Forms of Time and of the Chronotope," 84.

[28] میر امن دہلوی، باغ و بہار، مرتبہ: رشید حسن خاں، (لاہور: مجلس ترقی ادب، 2007ء)،

[29] مرزا اسد اللہ خاں غالب، دیوانِ غالب (نسخۂ عرشی)، مرتبہ: امتیاز علی خاں عرشی، (علی گڑھ: انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۵۸ء)

[30] ڈاکٹر وزیر آغا، اردو شاعری کا مزاج، (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۷۴ء)

[31] ڈپٹی نذیر احمد، ابن الوقت، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء)

[32] Gérard Genette, *Narrative Discourse: An Essay in Method*, trans. Jane E. Lewin (Ithaca: Cornell University Press, 1980), 35.

[33] قرۃ العین حیدر، آگ کا دریا، (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 1990ء)، ص 109

[34] ناہید قمر، اردو فکشن میں وقت کا تصور، ص ۱۱۰

[35] انتظار حسین، بستی، (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۲ء)

[36] شوکت صدیقی، خدا کی بستی، (لاہور: الفیصل ناشران و تاجرانِ کتب، ۲۰۰۱ء)

[37] مستنصر حسین تارڑ، بہاؤ، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۲۱ء)

[38] Cathy Caruth, *Unclaimed Experience: Trauma, Narrative, and History* (Baltimore: Johns Hopkins University Press, 1996), 4.

[39] Gabriel Zoran, "Towards a Theory of Space in Narrative," *Poetics Today* 5, no. 2 (1984): 309.

[40] سعادت حسن منٹو، ''ٹوبہ ٹیک سنگھ''، مشمولہ پھندنے، (دہلی: مکتبہ جدید، ۱۹۵4ء)، ص23

[41] Edward W. Said, *Reflections on Exile and Other Essays* (Cambridge, MA: Harvard University Press, 2000), 173.

[42] سعادت حسن منٹو، ''ٹوبہ ٹیک سنگھ''

[43] محمد اقبال، ''مسجدِ قرطبہ''، مشمولہ بالِ جبریل، ص42

[44] محمد اقبال، ''مسجدِ قرطبہ''، مشمولہ بالِ جبریل، ص43

[45] Pierre Nora, "Between Memory and History: Les Lieux de Mémoire," *Representations*, no. 26 (1989): 7.

[46] Linda Hutcheon, *A Poetics of Postmodernism: History, Theory, Fiction* (New York: Routledge, 1988), 5.

[47] Mircea Eliade, *The Myth of the Eternal Return*, trans. Willard R. Trask (Princeton: Princeton University Press, 1954), 139.

[48] David Harvey, *The Condition of Postmodernity: An Enquiry into the Origins of Cultural Change* (Oxford: Blackwell, 1989), 240.

[49] شمس الرحمٰن فاروقی، افسانے کی حمایت میں، طبع سوم، (نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۲۰۰۶ء)

مآخذ

اردو و عربی ماخذ

القرآن الحکیم۔

مسلم بن الحجاج، امام۔ صحیح مسلم۔ لاہور: مکتبۃ الاشاعت، اردو بازار، 2007ء۔

اقبال، علامہ محمد۔ بالِ جبریل۔ نئی دہلی: اعتقاد پبلیشنگ ہاؤس، 1981ء۔

انتظار حسین۔ بستی۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۲ء۔

تارڑ، مستنصر حسین۔ بہاؤ۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۲۱ء۔

حیدر، قرۃ العین۔ آگ کا دریا۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 1990ء۔

شوکت صدیقی۔ خدا کی بستی۔ لاہور: الفیصل ناشران و تاجرانِ کتب، ۲۰۰۱ء۔

عشرت شاہین (مرتب)۔ زمان و مکاں۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء۔

غالب، مرزا اسد اللہ خاں۔ دیوانِ غالب (نسخۂ عرشی)۔ مرتبہ: امتیاز علی خاں عرشی۔ علی گڑھ: انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۵۸ء۔

فاروقی، شمس الرحمٰن۔ افسانے کی حمایت میں۔ طبع سوم۔ نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۲۰۰۶ء۔

منٹو، سعادت حسن۔ پھندنے۔ دہلی: مکتبہ جدید، ۱۹۵4ء۔

میر امن دہلوی۔ باغ و بہار۔ مرتبہ: رشید حسن خاں۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، 2007ء۔

نارنگ، گوپی چند، ڈاکٹر۔ ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات۔ نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ۲۰۰۴ء۔

ناہید قمر، ڈاکٹر۔ اردو فکشن میں وقت کا تصور۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۸ء۔

نذیر احمد، ڈپٹی۔ ابن الوقت۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء۔

وزیر آغا، ڈاکٹر۔ اردو شاعری کا مزاج۔ علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۷۴ء۔

انگریزی ماخذ

Augustine. *Confessions*. Translated by Henry Chadwick. Oxford: Oxford University Press, 1991.

Bachelard, Gaston. *The Poetics of Space*. Translated by Maria Jolas. Boston: Beacon Press, 1994.

Bakhtin, M. M. *The Dialogic Imagination: Four Essays*. Edited by Michael Holquist. Translated by Caryl Emerson and Michael Holquist. Austin: University of Texas Press, 1981.

Bergson, Henri. *Time and Free Will: An Essay on the Immediate Data of Consciousness*. Translated by F. L. Pogson. London: George Allen & Unwin, 1910.

Caruth, Cathy. *Unclaimed Experience: Trauma, Narrative, and History*. Baltimore: Johns Hopkins University Press, 1996.

Eliade, Mircea. *The Myth of the Eternal Return*. Translated by Willard R. Trask. Princeton: Princeton University Press, 1954.
Forster, E. M. *Aspects of the Novel*. London: Edward Arnold, 1927.
Foucault, Michel. "Of Other Spaces." Translated by Jay Miskowiec. *Diacritics* 16, no. 1 (1986): 22-27.
Frank, Joseph. "Spatial Form in Modern Literature: An Essay in Two Parts." *The Sewanee Review* 53, no. 2 (1945): 221-240.
Genette, Gérard. *Narrative Discourse: An Essay in Method*. Translated by Jane E. Lewin. Ithaca: Cornell University Press, 1980.
Harvey, David. *The Condition of Postmodernity: An Enquiry into the Origins of Cultural Change*. Oxford: Blackwell, 1989.
Heidegger, Martin. *Being and Time*. Translated by John Macquarrie and Edward Robinson. London: SCM Press, 1962.
Hutcheon, Linda. *A Poetics of Postmodernism: History, Theory, Fiction*. New York: Routledge, 1988.
Iqbal, Muhammad. *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*. Edited by M. Saeed Sheikh. Lahore: Iqbal Academy Pakistan and Institute of Islamic Culture, 1989.
Kant, Immanuel. *Critique of Pure Reason*. Translated by Paul Guyer and Allen W. Wood. Cambridge: Cambridge University Press, 1998.
Lefebvre, Henri. *The Production of Space*. Translated by Donald Nicholson-Smith. Oxford: Blackwell, 1991.
Lessing, Gotthold Ephraim. *Laocoön: An Essay on the Limits of Painting and Poetry*. Translated by Edward Allen McCormick. Indianapolis: Bobbs-Merrill, 1962.
Lorentz, H. A., A. Einstein, H. Minkowski, and H. Weyl. *The Principle of Relativity*. New York: Dover Publications, 1952.
Mendilow, A. A. *Time and the Novel*. London: Peter Nevill, 1952.
Newton, Isaac. *The Principia: Mathematical Principles of Natural Philosophy*. Translated by I. Bernard Cohen and Anne Whitman. Berkeley: University of California Press, 1999.
Nora, Pierre. "Between Memory and History: Les Lieux de Mémoire." *Representations*, no. 26 (1989): 7-24.
Ricoeur, Paul. *Time and Narrative*. Vol. 1. Translated by Kathleen McLaughlin and David Pellauer. Chicago: University of Chicago Press, 1984.
Said, Edward W. *Reflections on Exile and Other Essays*. Cambridge, MA: Harvard University Press, 2000.
Tuan, Yi-Fu. *Space and Place: The Perspective of Experience*. Minneapolis: University of Minnesota Press, 1977.
Zoran, Gabriel. "Towards a Theory of Space in Narrative." *Poetics Today* 5, no. 2 (1984): 309-335.